جیلانی بانو

(پیدائش:1933)

جیلانی بانو کا اصل وطن بدایوں (اترپردیش) ہے۔ ان کے والد حیدرآباد (آندھرا پردیش) جاکر بس گئے اور یہیں ان کی پیدائش ہوئی۔

جیلانی بانو کا پہلا افسانوی مجموعہ ''روشنی کے مینار'' 1958 میں شائع ہوا۔ ''نروان'' اور ''پُن'' اُن کے دوسرے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں۔ انھوں نے کئی ناولٹ بھی لکھے جن میں ''جگنو اور ستارے'' اور ''نغمے کا سفر'' کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے دو ناول ''ایوانِ غزل'' اور ''بارشِ سنگ'' بہت مقبول ہوئے۔

جیلانی بانو کے افسانوں اور ناولوں کا اصل موضوع حیدرآباد کے زوال کے بعد جاگیرداروں کی بکھرتی ہوئی زندگی ہے۔ انھیں زبان و بیان پر قدرت ہے۔ اس کے علاوہ وہ حیدرآباد کی مخصوص بولی کا استعمال بھی بڑی چابکدستی سے کرتی ہیں۔

5019CH09

دوشالہ

آخر سرور کے سمجھانے بُجھانے سے امّاں جان کا دل ہار ہی گیا۔ اُن کا دل جواب اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ مدافعت کی سکت ہی نہ رہی تھی۔ اور وہ دن آن پہنچا کہ ان کا ٹوٹا پھوٹا صندوق رسیّوں سے جکڑا دالان میں رکھا تھا۔ سرور نے اس کے اوپر سُتلی سے بندھا ہوا بستر، ایک لوٹا، ناشتے دان اور پان دان لا کر رکھ دیا تھا۔ بہو نے انھیں اپنا پُرانا بُرقع ٹھیک ٹھاک کر کے دے دیا۔ اس عمر میں انھیں اپنا چاند سا چہرہ چھپانے کے لیے اب سیاہ برقع کی تو ضرورت نہ تھی۔

گھِسی ہوئی آدھی آدھی سلیم شاہی جوتیاں انگوٹھوں میں اٹکائے وہ سارے گھر میں سٹر پٹر کرتی پھر رہی تھیں۔ اپنی سٹھیائی ہوئی یادوں کو اکٹھا کر کے بار بار سوچتیں کہ ابھی کون کون سی چیزوں کی اُٹھا دھری کرنی ہے؟ اُن پر وہ وحشت سوار ہو چکی تھی جو سفر کا آغاز ہوتی ہے۔

اِدھر اُنھوں نے کمرے سے باہر قدم رکھا اُدھر ان کا پوتا توقیر اور اس کی بہن جمال کوٹھری کا جائزہ لینا شروع کر دیتے تھے۔ وہاں کی ہر چیز اماں جان کے کام کی تھی۔ مکڑی کے جالے بھرے، ٹوٹے پھوٹے سامان کے ڈھیر پر وہ مایا کا سانپ بنی بیٹھی تھیں۔ جمال محض انھیں ستانے کے لیے اگر زمین پر سے پان کا ڈنٹھل بھی اُٹھا لیتی تھی تو وہ چونک پڑتیں۔

''اے بیٹا کیا لیے جائے ہے۔ وہ میرے کام کی ہے۔'' اب انھیں دور سے سوجھائی تھوڑی دیتا تھا۔ بس یوں ہی الل ٹپ کہہ دیتیں۔

''یہ پان کا ڈنٹھل بھی۔۔۔؟'' جمال بُرا مان کر دکھاتی۔۔۔

''دیکھوں۔۔۔'' وہ اس کی ہتھیلی اپنی آنکھوں سے لگا کر یقین کر لیتیں۔

''مگر تجھے ہر چیز اُٹھانے کا لپکا کیوں ہے۔۔۔؟''

ان کا جی ڈوب جاتا تھا۔ ان بچّوں کی وجہ سے تو ہر وقت ان کی گردن پر تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ انھیں اپنے پوتے اور پوتی سے نفرت ہو۔ مگر جن کے پاس دولت ہو اس کا دل تو دھڑکا ہی کرتا ہے۔ ہر طرف ڈاکوؤں کے پڑاؤ نظر آتے ہیں۔ ان کے چار بڑے لڑکے ایک لڑکی سمیت پاکستان سِدھار چکے تھے۔ ایک سرور تھا کہ کلرکی پر قناعت کیے، باپ دادا کی اس پرانی

حویلی میں چراغ جلا رہا تھا۔ اس حویلی کی بھی امّاں جان کی طرح کمر جھک چکی تھی اور دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ دراصل سرور کی بیوی نہ چاہتی تھی کہ وہاں بھی چار جٹھانیاں اور ایک ساس ہر وقت اُسے بہو بہو پکار کر اس کی گردن جھکائے رکھیں۔ مگر امّاں جان گھر نہ چھوڑنے کے بہانے اب بھی آنکس سنبھالے اس کی گردن پر سوار تھیں۔

ویسے گھر سے مراد اب صرف ان کی کُٹھریا تھی۔ جوں جوں گھر پر بہوؤں اور ان کی اولاد کا قبضہ ہوتا گیا وہ پیچھے ہٹتی گئیں۔ یہاں تک کہ اب اس ٹپکتی چھت کی سیلی کوٹھری پر ان کی اجارہ داری رہ گئی تھی، وہاں انھوں نے ہر وہ چیز جمع کر رکھی تھی جو ان کی بہوؤں کے خیال میں پھینک دینے کے قابل تھی۔ وہاں ان کی زندگی کے سارے ٹوٹے پھوٹے زنگ آلودہ کل پُرزے پڑے تھے۔ ٹوٹے ہوئے فانوس کے رنگین ٹکڑے۔ زندگی بھر ساری تقریبوں میں سِیے جانے والے کپڑوں کی کترنیں۔ اُن بچّوں کے کھلونے جن کے بچّے بھی اب کھلونوں سے نہیں بہلائے جا سکتے۔ یہ سب دولت انھوں نے لکڑی کے صندوقوں میں اتنی احتیاط سے چھپا رکھی تھی جیسے حنوط کر کے اپنی یادوں کی ممیاں سجا رکھی ہوں۔ اس میں وہ زربفت کی اچکن تھی جو امّاں جان کے ابّا نے دولھا بنتے وقت پہنی تھی اور ان سچّی چینی کی رکابیوں کے ٹکڑے تھے جو ان کی امّاں اپنے جہیز میں لائی تھیں، ان کے ابّا کا فرغل تھا اور ان کے دادا کا تاریخی دوشالہ۔

جس وقت وہ ساری بازیاں ہار کے زندگی کے ناپیدا کنار سمندر میں غوطے لگا رہی تھیں تو اس دوشالے کی محبت گُم شدہ جزیرے کی طرح پالی تھی، ان کی اندھیری کوٹھری میں وہ ہزار کینڈل پاور کا بلب تھا جس کی روشنی میں کوئی راہ کٹھن نہ لگتی تھی۔

دوشالے کا کپڑا ہر ہر تہہ پر سے پاپڑ کی طرح ٹوٹ چکا تھا۔ مگر اس کے کارچوب میں سے کئی سیر چاندی نکالی جا سکتی ہے...... یہ بات ایک دن بیوی نے سرور کو سمجھائی۔

اور دوسرے دن امّاں جان اپنے بیمار بھتیجے کو دیکھنے گئیں تو وہ دوشالہ بڑی احتیاط سے نکالا گیا۔ بہو نے اس کی جگہ اپنی پرانی رضائی رکھ کر سات گٹھریوں کی تہیں پکّے ٹانکوں سے سِیں۔ اُسی طرح سے پُرانا ازار بند اوپر سے لپیٹ کر صندوق میں رکھا اور صندوق کے اوپر سب گٹھریاں، پوٹلیاں، افیون کی ڈبیہ، دواؤں کی شیشیاں اور بالائی کا دونا ہر چیز یوں جمائی کہ سوائے گرد کے کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ امّاں جان کی آنکھوں میں اب اتنا دم کہاں تھا کہ روز روز پکّے ٹانکے اُدھیڑ کر دوشالے کو زمانے کی ہوا سے میلا کرتیں۔ اس لیے وہ بڑے اطمینان سے بہو کی پُرانی رضائی سینے سے لگائے جیے جا رہی تھیں۔ رات رات بھر جاگ کر اس کی حفاظت کرتیں۔ بات بات پر اونچی ہو کر بہو کو جواب دیتیں۔ بلا سے ان کا بیٹا ایک ایک پیسے کو ترسائے۔ وہ چاہیں تو آج اپنے دادا کا دوشالہ بیچ کر ٹھاٹ کریں۔ اس دوشالے کی حفاظت کے لیے ان کے سارے بھولے بسرے خواب چوکھٹ پر دھرنا دیے بیٹھے

رہتے تھے۔ اگر ذرا سی لاپروائی سے خدانخواستہ دوشالہ کھو جائے تو اس کے ساتھ امّاں جان کا بچپن کھو جاتا، بیاہی زندگی کی اذیّت ناک مٹھاس اور بڑھاپے کی تسکین آمیز کڑواہٹ....توبہ ہے۔ اب اتنی لاشوں پر رونے کے لیے آنسو کہاں سے آئیں گے۔ اسی لیے تو انھیں اپنے پانچ بچّوں کو ان کی اولاد سمیت بھول جانا پڑا تھا۔ وہاں سے جس کا خط آتا امّا جان کے لیے تڑپ رہا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ امّاں پر کس کی محبت خدائی کر رہی ہے....! وہ....تو....اپنی دانست میں چھوٹے بیٹے کی محبت کے طعنے دیتے تھے۔ یا پھر امّاں جان سے اپنا وطن نہیں چھوڑا جاتا۔ اب یہ کون جانتا تھا کہ اگر کوئی ان کی گٹھریا اٹھا کر دوزخ میں رکھ دے تو وہ وہاں بھی اسی سکون کے ساتھ صندوق سے پیٹھ لگائے تسبیح پڑھے جائیں گی۔ دن بھر میں صرف دو تین بار کسی خاص ضرورت کے لیے کھلے آسمان تلے سے گُزرتی تھیں۔ اُن کی بلا سے یہ آسمان ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا۔
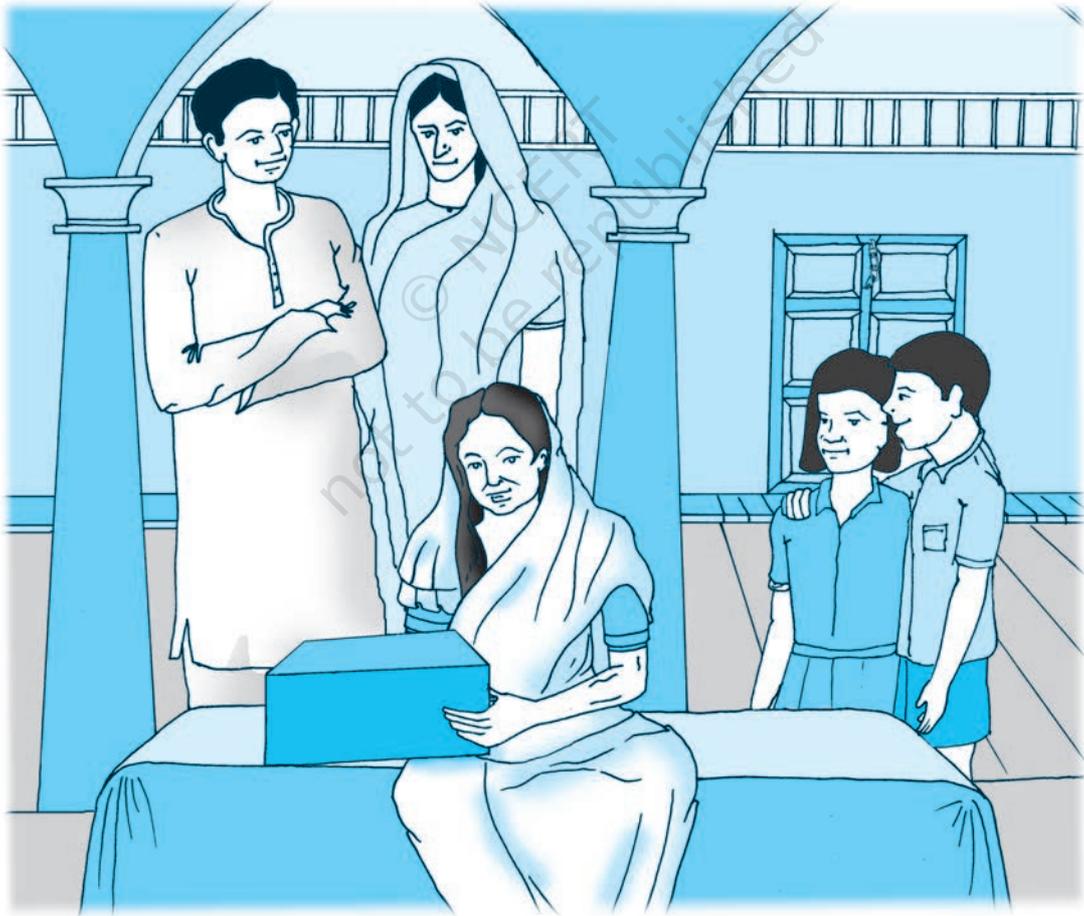
کبھی کبھی جمال ان کا پلّو پکڑ کر ٹھنکنے لگتی۔ ''دادی! ہمیں لکڑ دادا کا دوشالہ دکھایئے۔''

''اچھا اچھا کسی دن دکھا دوں گی۔'' وہ ٹال جاتیں کیوں کہ سامان کھول کر بیٹھتی تھیں تو جمال اور توقیر چھینا جھپٹی شروع کر دیتے تھے۔ کوئی فانوسوں کے شیشے لیے بھاگا جا رہا ہے۔ کوئی مٹّی کی ٹوٹی گڑیا پار کرنے کی فکر میں ہے۔ گھبرا کر وہ صندوق بند کر دیتی تھیں۔ اگر یوں سخی داتا بن کر بیٹھتیں تو یہ گنجہائے گراں مایہ کیسے جمع ہو پاتے۔ نوادرات جمع کرنا کیسا جان جوکھم کا کام ہے۔ یہ تو کچھ وہی جانتا ہے جس نے امّاں جان کی طرح اپنا عیش و آرام تج دیا ہو۔

وہ تو زندگی کے بچے کھچے دن بھی اسی طرح گزارنے کا پکّا ارادہ کیے بیٹھی تھیں کہ اُن کے بڑے بیٹے کا خط آیا۔ ان کی بڑی پوتی کا بیاہ طے ہو چکا تھا۔ اگر اب بھی امّاں جان نہ آئیں تو پھر کبھی نہ آئیں۔ ان کے بیٹے سمجھتے تھے کہ امّاں ٹوٹے ٹھیکروں کے نیچے سونے کی اینٹیں چھپائے بیٹھی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن امّاں کے سو جانے کا تار آ جائے اور سرور کے نصیب جاگ اُٹھیں۔ کوٹھریا کی دولت زندگی کی طرح پیاری تھی مگر زندگی تو نہ تھی۔ کیا معلوم کل کلاں کو ان کی آنکھیں پٹ سے بند ہو جائیں اور اُن کے بچّے پاکستان میں بیٹھے انھیں پکارتے رہ جائیں۔

انھیں سمجھانے کے لیے حالات اپنی دلیلیں لے کر آئے اور وہ بے بس ہو گئیں۔ سرور کو تو اللہ میاں نے چھپّر پھاڑ کر موقع دیا تھا۔ لپائیں چھپائیں پاسپورٹ تیار کروا لایا۔ ساتھ کے لیے ایک دوست بھی ڈھونڈ دیا۔ بہو نے آناً فاناً سامان تیار کر کے دالان میں رکھ دیا۔ مارے محبت کے امّاں جان کے لیے خالص گھی کی کہہ کر بنا سپتی میں کھجوریں بھی تل دیں۔

امّاں جان نے دوشالہ جیسی قیمتی چیز ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ کون جانے وہاں ان کے بیٹے اُلٹی سیدھی پٹّی پڑھا کر دوشالہ ہتھیا لیں تو....! اور جو کچھ صندوق میں بھرا جا سکا ٹھونس لیا۔ جب انھوں نے ایک بھرپور نگاہ ڈال کر کوٹھری کو تالا لگایا تو آنکھوں سے سیلاب اُمڈ پڑا۔ جیسے انھوں نے زندگی کی ساری ہاریں، سب جیتیں اندر بند کر دی ہوں۔ پھر وہ بہو سے لپٹ کر خوب روئیں۔

''اب یہ کوٹھری تمھارے حوالے کر رہی ہوں۔ میرے بعد تم ہی اس کی مالک ہوگی۔''

یہ بات اُنھوں نے بڑے سوچ بچار کے بعد کہی تھی۔ تاکہ بہو ابھی سے بے صبر نہ ہو جائے۔

''دادی آپ لکڑ دادا کا دوشالہ کون سے صندوق میں رکھے جا رہی ہیں......؟'' توقیر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''خبردار جو دادی کو جاتے وقت ستایا۔'' بہو نے اس کے دو تھپّڑ لگائے اور امّاں جان کو قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ کوٹھری کی کوئی چیز نہ چھوئیں گی۔

ریل میں بیٹھیں تو ان کا جی بالکل ہلکا تھا۔ انھوں نے کوٹھری میں یہ موٹا علی گڑھ کا تالا ڈالا تھا۔
صرف تین مہینے کی تو بات ہے۔ انھوں نے غیر ارادی طور پر ازار بند میں کُنجی ٹٹولی۔
بمبئ پہنچ کر ایک ہفتہ ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ سرور کے دوست نے جانے کیا مشکل سا نام بتایا کہ امّاں جان کا ''وہ'' نہیں بنا ہے۔ آخر اللہ اللہ کر کے تھکی ہاری امّاں جان جہاز میں سوار ہوئیں۔ تب سرور کے دوست نے جیب میں سے ایک پوسٹ کارڈ نکال کر انھیں سُنایا۔ یہ پوسٹ کارڈ اُن کے پوتے توقیر نے بڑی نستعلیق اردو میں لکھا تھا۔

دادی جان۔ سلام الیکم اور قدم بوسی

یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت نیک مَتلوب۔ دیگر اہوال یہ ہے کہ جناب لکڑ دادا صاحب کا دوشالہ کہیں نہ ملا۔ میں نے اور جمالو نے سارا کمرہ چھان مارا۔ براکرم بواپسی ڈاک مُتلّے فرمائیے کہ آپ دوشالہ کہاں رکھ گئی ہیں......!

جمالو آپ کو سلام لکھوا رہی ہے۔ فقط

آپکا خادم
توقیر مرزا۔ متعلّم جماعت پنجم (الف)
بقلم خود

خط سُنانے کے بعد سرور کے دوست نے دیکھا کہ امّاں جان اُس دوشالے کی تلاش میں کہیں جا چکی ہیں۔ تعجب کے مارے ان کا منھ کُھلا رہ گیا تھا اور مُٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں........ جیسے وہ دوشالے کو پکڑے لٹکتی رہ گئی ہوں......

—— جیلانی بانو

سوالوں کے جواب لکھیے:

1۔ امّاں جان کو دوشالے سے لگاؤ کیوں تھا؟
2۔ امّاں جان دوشالے کی حفاظت کے لیے کیا کیا تدبیریں کرتی تھیں؟
3۔ ''ان کی اندھیری کوٹھری میں وہ ہزار کینڈل پاور کا بلب تھا جس کی روشنی میں کوئی راہ کٹھن نہ لگتی تھی'' اس جملے کی وضاحت کیجیے۔
4۔ توقیر کا خط صحیح الفاظ کے ساتھ لکھیے۔